پاکستان میں انتخابی عمل اور اسمبلیوں کی شکست و ریخت
(پس منظر و پیش منظر)

محمد خورشید

اسلام میں ریاست و حکومت کا تصور نمائندہ حکومت' قانون کی بالا دستی اور مساوات پر مبنی ہے۔ ایک ایسا نظام جس میں امیر و غریب سب قانون کے سامنے برابر ہوتے ہیں۔ اسلام پوری امہ کو سیاسی آزادی اور جمہوری حقوق کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اسلام میں انسان کی انسان پر حکمرانی کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے اور اسلامی ریاست میں اکثریت کو چند افراد کے جبر سے آزاد رکھا گیا ہے۔ ابتداء ہی سے اسلامی نظام حکومت میں مشاورتی کونسل (مجلس شوریٰ) کو اہمیت حاصل رہی ہے تاکہ عوام کی رائے اور مشورے سے حکومتی امور سرانجام دیے جائیں یعنی اسلام نے حکومت میں عوام کی شرکت پر زور دیا ہے جو جمہوری طرز حکومت کا بنیادی نقطہ ہے۔ اسلام میں مجلس شوریٰ کا مقام اور نماز جمعہ کے بعد خلیفتہ المسلمین کا عوام کے اجتماع کے سامنے اہم قومی امور' ملی اور سیاسی مسائل کا پیش کرنا ابتدائی اسلامی دور کے سیاسی ڈھانچے کا عملی ثبوت ہے۔ بلاشبہ اسلام جمہوری اقدار کے فروغ کی تائید کرتا ہے کیونکہ اسلام نے اس وقت ایک منتخب حکمران کا تصور پیش کیا جب عوامی امنگوں اور خواہشات پر مشتمل جمہوری نظام کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یعنی اکثریت کی رائے کے مطابق خلیفہ کا انتخاب' احتساب' مساوات' عدل و انصاف اور آزادی اظہار رائے کو اسلامی نظام کے بنیادی اصولوں کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حضرت امیر معاویہؓ کے دور حکمرانی میں خلافت' ملوکیت میں بدل گئی اور ملوکیت نے نمائندہ حاکمیت کا تصور ختم کر دیا لہٰذا جمہوری اقدار کے فروغ کی راہیں مسدود ہوگئیں۔ عوام کی جگہ علماء دین کو دربار میں مشیروں کا درجہ ملا جنہوں نے دنیاوی جاہ و جلال اور مال و زر کی ہوس کی وجہ سے غیر جمہوری کردار ادا کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ بہت سے مسلمان بادشاہوں کو مسند حکومت ان ہی علماء کی تائید و حمایت کے سبب ملی۔ جنوبی ایشیا میں عوامی ذہنوں کی تعمیر و تربیت کچھ اس طرح سے ہوئی کہ ان پر ترک' افغان اور مغل مطلق

العنان بادشاہ مسلط رہے۔ ان کے دائیں بائیں خود غرض علماء اور خوشامدی امراء کی صفیں تھیں، آگے سپاہیوں کا ہجوم اور پیچھے غلاموں کا جم غفیر تھا۔ صدیوں کی حکومت کے بعد یہ یقین پختہ ہوگیا تھا کہ مغل شہنشاہیت کے مضبوط ایوانوں سے زیادہ عوام کی شاہ پرستی کو دخل تھا اور خدا کی زمین پر "خدا کے نائب" کی حکومت کو للکارنے کی جرات کوئی نہ کرسکتا تھا۔ اس پہ طرہ یہ کہ عوام کو مزید محکوم رکھنے کے لئے جاگیرداری نظام کو فروغ دیا گیا۔ مسلمانوں میں بنو امیہ نے اس نظام کا آغاز کیا جبکہ جنوبی ایشیا میں سلاطین دہلی نے اس نظام کو حکومتی امور کے لئے ضروری سمجھا اور بعد ازاں ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر تاج برطانیہ نے اس نظام کار سے اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کی۔

قرون وسطیٰ کی یورپی ریاستیں بھی مطلق العنان بادشاہوں کے تابع فرمان تھیں لیکن انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) کے بعد بیشتر ریاستوں بالخصوص برطانیہ میں جمہوری عمل غالب نظر آنے لگا جہاں تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز سے پارلیمانی جمہوری طرز کی حکومتوں کی ترتیب و تشکیل کا عمل شروع ہو چکا تھا۔[1] اگرچہ برطانیہ میں بھی جاگیردارانہ نظام موجود تھا تاہم اٹھارویں صدی میں وہاں اس نظام نے دم توڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس طرح کہ زمین اور انسان کی ترتیب و ترکیب بدل کر اب سرمائے اور محنت کی ترتیب و ترکیب بن رہی تھی۔ ابھرتا ہوا سرمایہ داری نظام اپنے جوہر میں اتنا ہی استحصالی تھا جتنا کہ جاگیرداری نظام، لیکن ابھی یہ ثابت ہونے کا وقت نہیں آیا، ابھی تو یہ نظام جمہوریت کے لئے ایک مددگار کا کردار ادا کر رہا تھا۔[2] بعد ازاں اس استعماری قوت نے پوری دنیا میں نو آبادیاتی نظام قائم کیا تو جنوبی ایشیا بھی ان کا تختہ مشق بنا۔ ۱۸۵۷ء میں اس خطے میں بعض آزادی پسند قوتوں نے قسمت آزمائی کرتے ہوئے آزادی کی جنگ لڑی لیکن فرق صرف اتنا ہوا کہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ کے فرمان کے مطابق پورے برصغیر کو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بجائے تاج برطانیہ کے ماتحت کر دیا گیا جس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ برطانیہ عظمیٰ کی طرح یہاں بھی آئینی اور قانونی اداروں کی تشکیل کی بازگشت سنائی دینے لگی جو مغلیہ طرز کی ہندوستانی بادشاہت میں شاید ممکن نہ ہوتی۔

جنوبی ایشیا میں جمہوری عمل کے ارتقاء کی تاریخ کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ایک جمہوری معاشرے کے لئے انتخابات کے مفہوم، مقصد، اہمیت اور رائے دہی کے بارے میں بحث کی جائے۔ جمہوریت اس طرز حکومت کو کہتے ہیں جو عوام سے ہو، عوام کے ذریعے وجود میں آئے اور عوام

کے لئے بلا امتیاز کام کرے اور انتخابات اس جمہوری عمل کا نام ہے جس کے ذریعے عوام اپنے نمائندوں کو منتخب کرتے ہیں جسے حقیقی جمہوریت کے قیام کے لئے لازمی عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ جبکہ جمہوری طرز حکومت کا بنیادی مقصد مملکت میں عوام کی زیادہ سے زیادہ شمولیت کو یقینی بنانا ہوتا ہے۔ جمہوریت میں عوام کے منتخب نمائندے ہی ملک کے حکمران ہوتے ہیں جو ریاستی امور عوام کی خواہش کے مطابق سرانجام دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ حکومت جو عوام کی خواہشات کا احترام نہیں کرتی جمہوری حکومت کہلانے کی حق دار نہیں اور عوام کی خواہشات اور امنگوں کا تعین کرنے کے لئے رائے دہی ہی سب سے مناسب طریق کار ہے۔ ووٹ دینے کے حق کو حق رائے دہی کہا جاتا ہے۔ ووٹ کے لغوی معنی دو یا دو سے زیادہ افراد میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہے۔ مغرب کے ایک ماہر سیاسیات ہرنگٹن کے مطابق ووٹ دینا ان لوگوں کا حق ہے جو قانون کی اطاعت گزاری کرنے کے ساتھ ساتھ ٹیکس ادا کرتے ہیں اور بوقت ضرورت حکومت بنانے اور ہٹانے کا حق استعمال کرتے ہیں۔ جے۔ ایس۔ مل نے ووٹر کے لئے تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ ٹیکس دہندہ ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روح سے رائے دہندہ کے لئے صالح، متقی، قابل اور پرہیزگار ہونا لازمی ہے۔

موجودہ جمہوری ممالک میں ووٹ دینا ایک بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی حق پر جمہوریت کی بنیادیں استوار ہیں۔ جس شخص کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو وہ رائے دہندہ کہلاتا ہے جبکہ جمہوریت کا یہ تقاضا ہے کہ ملک کے تمام بالغ افراد کو رائے دینے کا حق حاصل ہونا چاہئے اور اس حق پر تعلیم، جائیداد، جنس، زبان، مذہب، رنگ اور نسل کی بنیاد پر کوئی پابندی عائد نہیں ہونی چاہئے۔ البتہ بلوغت کی عمر کا تعین کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ پاکستان میں موجودہ آئین کے مطابق اکیس سال کی عمر کے مرد اور خاتون کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ کسی بھی جمہوری معاشرے میں انتخابات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور انتخابی عمل ہی سے بار بار گزر کر یہ ممکن ہوتا ہے کہ جمہوریت محض ایک طرز حکومت نہیں بلکہ طرز زندگی بن جائے۔ منصفانہ انتخابات کو عوامی عدالت کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور ہر امیدوار اپنا نامہ اعمال لیے عوام کے سامنے پیش ہوتا ہے اور عوام اس کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ لہٰذا جمہوریت کی بقاء کے لئے ضروری ہے کہ انتخابات منصفانہ، آزادانہ اور شفاف ہوں۔ موجودہ دور کی جمہوریت اکثریت کے اصول پر قائم ہے۔ جو امیدوار زیادہ ووٹ حاصل کرے وہی

نمائندہ منتخب ہوتا ہے۔ صحت مند جمہوریت کے لئے ضروری ہے کہ عوام کو خفیہ رائے دہی کے طریق کار کے تحت اپنے ضمیر کے مطابق' موزوں امیدوار منتخب کرنے کا اختیار حاصل ہونا چاہئے کیونکہ اس سے عوام کے احساس ذمہ داری اور سیاسی شعور کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جہاں جمہوریت کی بقاء کے لئے رشوت' دھونس اور دھاندلی کے مرتکب افراد کو مسترد کرنا ضروری ہے وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ رائے دہندہ گان بیدار مغز' دیانتدار' سیاسی شعور کے مالک ہوں اور انہیں ووٹ قومی امانت سمجھتے ہوئے احساس ذمہ داری کے ساتھ مستحق امیدواروں کے حق میں استعمال کرنا چاہئے تاکہ دیانتدار اور اہل قیادت ملک کی باگ ڈور سنبھال سکے۔ قومی مفادات کے تحفظ کے شعور کو بیدار کرنے کے لئے رائے دہند گان کی سیاسی تربیت ضروری ہے تاکہ وہ اچھے اور برے میں تمیز کر سکیں اور کسی بھی قسم کے دباؤ یا غیر اخلاقی حربے کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کرسکیں۔ صحت مند جمہوری نظام کی تشکیل کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے تمام شہریوں کو بنیادی حقوق یعنی تحریر و تقریر' بحث و تمحیص اور حکومتی امور پر صحت مند تنقید کی آزادی ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ قومی پریس کا آزاد اور محب الوطن پالیسیوں سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے تاکہ وہ رائے عامہ کو منظم کرنے اور قومی مسائل سے آگاہ کرنے کے لئے مثبت کردار ادا کر سکے۔ جمہوریت کا دائرہ کار صرف طرز حکومت تک محدود نہیں ہوتا بلکہ جمہوریت کسی بھی ملک کے نظام کار کو بطریق احسن چلانے کے لئے مساوات' انصاف' آزادی رائے اور جوابدہی جیسے بنیادی اصول وضع کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر آزاد اور خود مختار ریاست نے جمہوری اقدار کو اپنے معاشرتی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ برطانیہ میں خودمختار پارلیمنٹ اور بادشاہت پارلیمانی جمہوریت کا لازمی حصہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور فرانس میں صدارتی طرز حکومت جمہوریت کی بنیاد ہیں۔ جرمنی میں متناسب نمائندگی کا اصول رائج ہے۔ ترکی' مصر اور ملائشیا میں بھی جمہوری طرز حکومت ہے لیکن وہ برطانیہ یا امریکہ کے جمہوری نظام سے مختلف ہیں۔

جمہوریت کے بنیادی خدوخال کا سرسری جائزہ لینے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے جمہوری عمل اور رائے دہندگان کے کردار کا تجزیہ کرنے سے قبل ان جمہوری ارتقائی مدارج کا خلاصہ پیش کیا جائے جن سے ہم آہنگ ہوکر مسلمانان ہند علیحدہ وطن حاصل کرنے کے قابل ہوئے۔

جنوبی ایشیا میں ۱۸۶۱ء میں گورنر جنرل کی انتظامی کونسل میں ایک رکن کے اضافے کے ساتھ آئینی ترقی کے دور کا آغاز ہوا۔ کونسل کے ارکان میں محکمہ جات کی تقسیم کا طریق کار متعارف کراتے ہوئے ہر رکن کو کسی نہ کسی شعبے کا سربراہ مقرر کیا گیا جبکہ قانون سازی کے لئے چھ سے بارہ تک ارکان نامزد کرنے کا اصول وضع کیا گیا جن میں سے نصف کا غیر سرکاری ہونا لازمی تھا۔ اگرچہ اس ادارے کی تشکیل کے لئے انتخابات کی بجائے نامزدگی کے طریق کار کو اختیار کیا گیا لیکن اس کی تاریخی اہمیت یہ تھی کہ جنوبی ایشیا میں ایسے تجربے کا آغاز کیا جارہا تھا جو برطانیہ میں ایک عرصے سے کامیابی کے ساتھ جاری تھا۔ اگرچہ اسے جمہوری ادارہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس میں ہندوستانی نمائندے نہ ہونے کے برابر تھے اور نمائندگی انتخاب کے بجائے نامزدگی کے ذریعے عمل میں لائی جاتی تھی۔ یہ صورت حال بیسویں صدی کے آغاز تک برقرار رہی۔ ۱۹۰۹ء کے "انڈین کونسلز ایکٹ" کے تحت حکومت نے برطانوی ہند میں انتخابات کے جمہوری عمل کو متعارف کرانے کا فیصلہ کیا جبکہ لوکل سیلف گورنمنٹ کی سطح پر انتخابات کا طریق کار اس سے قبل ۱۸۸۲ء میں لارڈ رپن کے عہد میں اختیار کیا جاچکا تھا۔[3] اس ایکٹ کے مطابق رائے دہی کا اختیار میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں، ایوان ہائے تجارت، یونیورسٹیوں، مالکان اراضی اور مخصوص مفادات کے اداروں مثلاً" چائے اور پٹ سن اگانے والوں کو دیا گیا تھا۔ اگرچہ اس قانون کے تحت خودمختار جمہوری ادارے معرض وجود میں نہیں آئے تھے تاہم پہلی مرتبہ بالواسطہ طریق انتخاب کے تحت قانون ساز اداروں کے ارکان کو منتخب کئے جانے کے عمل کو متعارف کیا گیا تھا[4] اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ حق انتخاب کے اصول کے تحت الگ نشستیں مختص کی گئیں تھیں۔ اگرچہ امپیریل لیجیسلیٹو کونسل اور صوبائی کونسلوں میں اہل ہند کی شمولیت میں اضافہ کیا گیا[5] لیکن ان اداروں کی حیثیت مشاورتی کونسلوں سے زیادہ نہ تھی جو انتہائی وفادار اور خوشحال طبقات کے سرکردہ افراد پر مشتمل تھیں جنھوں نے ماضی میں سلطنت برطانیہ کے لئے سیاسی اور انتظامی سطح پر اہم خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس کے باوجود جمہوریت کی جانب یہ ایک خوش آئندہ اقدام تھا۔

۱۹۱۹ء کے "انڈین کونسلز ایکٹ" کے تحت آئینی اداروں کی تشکیل و ترتیب، نمائندگی اور اختیارات میں مزید پیش رفت ہوئی۔ مرکزی مجلس قانون ساز دو ایوانوں پر مشتمل قرار دی گئی۔ ایوان بالا (کونسل آف سٹیٹ) کے لئے ساٹھ ۶۰ ارکان، جن میں ایک تہائی سرکاری اور دو تہائی براہ راست

منتخب ہو کر آنا قرار پائے۔ ایوان زیریں ایک سو چوالیس ارکان پر مشتمل تھا جن میں سے منتخب ارکان کی تعداد ۵/۷ مقرر کی گئی تھی۔[۶] صوبوں میں دو عملی نظام متعارف کیا گیا جس کے تحت صوبائی محکمہ جات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ انتہائی اہمیت کے موضوعات مثلاً" مالیات، اراضی، عدلیہ اور آبپاشی کے محکمے حکومت نے اپنے نامزد ارکان کی تحویل میں دیے اور کم اہمیت کے محکمے مثلاً" لوکل سیلف گورنمنٹ، تعلیم، تعمیرات عامہ اور زراعت کے محکموں کو منتخب ارکان اسمبلی سے چنے جانے والے وزراء کی تحویل میں دیا گیا جو صوبائی کونسلوں کے سامنے جوابدہ تھے۔ جبکہ صوبائی گورنروں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وزراء کی عدم موجودگی میں منتقل شدہ شعبہ جات کا نظم و نسق خود چلائیں۔[۷] اس ایکٹ کے مطابق نیا انتخابی نظام ترتیب دیا گیا جس کے تحت ووٹر کی اہلیت کا معیار جائیداد اور ٹیکس کی ادائیگی مقرر کیا گیا۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو زمین کا مالک تھا یا اس پر کاشت کرتا تھا خواہ اس زمین کا رقبہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، ووٹ کا حق رکھتا تھا۔ تمام موجودہ اور سابق فوجیوں کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا۔ اس کے علاوہ وہ تمام لوگ ووٹ دینے کے حقدار ٹھہرے جن کے اپنے مکانات تھے اور ان کا کرایہ دو روپے ماہانہ تھا۔ اس طرح کافی وسیع انتخابی ادارہ وجود میں آچکا تھا جس میں اکثر رائے دہندگان ناخواندہ تھے۔ لہٰذا رائے دہندگان کی اکثریت جمہوریت اور قانون ساز اداروں کے اصل مقاصد اور افادیت سے قطعی لاعلم تھی۔ جنہیں امیدواروں کی خوبیوں سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ وہ قبیلے، ذات پات، برادری کے رشتوں سے متاثر تھے یا پھر اس بات کا اثر قبول کرنے پہ مجبور تھے کہ امیدوار یا اس کے رشتہ دار ان کے حق میں حکام بالا پر کس حد تک دباؤ ڈالنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ ذات برادری، جاگیرداری نظام اور پیری مریدی[۸] کا نظام ان انتخابات کا اہم جزو تھے تاہم انتخابات کا یہ عمل ایک بڑی تبدیلی کی علامت تھا جس کے تحت امیر آدمی غریب لوگوں کے پاس چل کر جانے پر مجبور ہو گیا تھا جس کے سبب "چھوٹے آدمی میں ایک ایسی طاقت پیدا ہوئی جو ماضی میں کئی صدیوں کے دوران بھی پیدا نہ ہوئی تھی"۔[۹] المختصر ۱۹۱۹ء کے "انڈین کونسلز ایکٹ" کے تحت صوبائی کونسلوں کے لئے پچاس لاکھ، مرکزی قانون ساز اسمبلی کے لئے دس لاکھ اور کونسل آف سٹیٹ کے لئے سترہ ہزار افراد کو رائے دہی کا حق دیا گیا تھا۔[۱۰] اس کے علاوہ خاص انتخابی حلقے بنائے گئے جو خاص مفادات کی نمائندگی کرتے تھے مثلاً" بڑے بڑے مالکان اراضی اور صنعتوں کے انتخابی حلقے۔ اسی طرح فرقہ وارانہ بنیاد پر نمائندگی کا جو اختیار

مسلمانوں کے لئے تسلیم کیا گیا تھا اسے پنجاب میں سکھوں، مدراس میں ہندوستانی عیسائیوں اور مقررہ صوبوں میں اینگلو انڈین اور یورپی باشندوں کے لئے بھی تسلیم کیا گیا۔ اس نئے قانون کے تحت ۱۹۲۰ء میں پہلے باقاعدہ انتخابات منعقد ہوئے، جن میں کانگریس اور مسلم لیگ نے خاطر خواہ دلچسپی نہ لی اور صوبوں میں علاقائی جماعتوں کو بہتر کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں دوسرے اور ۱۹۳۰ء میں تیسرے انتخابات ہوئے ہر سہ انتخابات کے نتیجے میں تقریباً" پندرہ سال تک صوبائی اور مرکزی قانون ساز اداروں نے اپنی اپنی حدود میں رہ کر کام کیا جس سے اہل ہند کو پارلیمانی امور کا خاصا تجربہ ہوا۔ ۱۹۳۵ء کے "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" کے تحت جمہوری اداروں کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ صوبوں میں ذمہ دار حکومتوں کا قیام عمل میں آیا اور وزراء کو عوام کی منتخب کردہ اسمبلی کے سامنے جوابدہ قرار دیا گیا۔ جائیداد کی شرط میں نرمی کرتے ہوئے رائے دہندگان کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ تقریباً" تین کروڑ افراد کو ووٹ کا حق حاصل ہوا جن میں سے خواتین بھی شامل تھیں۔ اس طرح کل رائے دہندگان کی تعداد ملک کی بالغ آبادی کے چھٹے حصے کے برابر پہنچ گئی۔ اس ایکٹ کے مطابق ۱۹۳۷ء میں صوبائی انتخابات منعقد ہوئے۔ کانگریس کو ہندو اکثریت کے صوبوں میں واضح کامیابی حاصل ہوئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کو بہت کم نشستیں ملیں مثلاً" پنجاب جو مسلم اکثریت کا صوبہ تھا وہاں سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر دو ارکان، راجا غضنفر علی اور ملک برکت علی منتخب ہوئے"[۱] بعد ازاں راجا غضنفر علی پارلیمانی سیکرٹری بننے کی لالچ میں یونینسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے۔ اس طرح عہدوں کے لئے گٹھ جوڑ اور اکھاڑ پچھاڑ کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک ہماری جمہوری روایات کا ایک لازمی حصہ بنا ہوا ہے۔ اسی طرح یوپی سے حافظ محمد ابراہیم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے لیکن جونہی انہیں کانگریسی وزارت میں شمولیت کا لالچ دیا گیا، انہوں نے اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہوکر ضمنی انتخاب میں دوبارہ کامیابی حاصل کی اور کانگریسی وزیر مقرر ہوئے۔ یہاں یہ ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا کہ وہ اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہو کر اور دوبارہ کانگریس کی ٹکٹ پر انتخاب لڑ کر سرخرو ہوگئے تھے۔[۲] ورنہ "آج ہماری جدید اسمبلیوں میں گھوڑے کبھی اس میدان کی گھاس چرتے ہیں کبھی اس کی، لیکن پارٹی بدلنے کی صورت میں اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہونے کا تصور تک موجود نہیں ہے"۔[۳] المختصر یہ ایک ایسی قوم کے رویے ہیں جسے ہندو خطرات کا سامنا تھا اور جمہوری نظام و طریق انتخاب میں نووارد تھی۔ سب سے بڑھ کر جو ابھی

محکوم تھی اور جسے ابھی اپنی آزادی کی طویل جنگ لڑنا تھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جمہوریت کے نوخیز پودے کو اس زمین پر پھلنے پھولنے سے پہلے ہی روندنے کی کوشش شروع ہو چکی تھی۔ لیکن سیاستدانوں کے ان منفی رویوں کے باوجود ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلمان رائے دہندگان کی بھاری تعداد نے مسلم لیگ کے حق میں تاریخ ساز فیصلہ دیا۔ جیسا کہ مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی جو ۱۹۲۴ء سے بدستور اقتدار پر قابض تھی، اس جماعت نے چھیاسی مسلم نشستوں میں سے صرف دس نشستیں حاصل کیں اور مسلم لیگ نے پچھتر نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ بہرحال درج بالا انتخابات میں سیاستدانوں نے جو طرز عمل اختیار کیا، اسمبلیوں میں جانے کے لئے جوڑ توڑ کا جو سلسلہ شروع کیا اور سرکاری و غیر سرکاری ذرائع سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کا جو رجحان پیدا ہوا وہ آگے چل کر یو پی کے تعلق داروں، اور پنجاب و سندھ کے جاگیرداروں کا مشغلہ بن گیا، جس کے نتیجے میں یہ لوگ مسلم لیگ پر قابض ہوگئے۔ ان ہی مفاد پرستوں نے مسلم لیگ میں شامل ہو کر، اسلام کے نام پر، سادہ لوح مسلمانوں سے ووٹ تو حاصل کر لئے تھے[۱۴] لیکن اس سرزمین پر بسنے والے عوام کو عزت و آبرو کے تحفظ اور دو وقت کی روٹی کمانے کی ضمانت فراہم نہ کر سکے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران نوکر شاہی نے جو کردار ادا کیا وہ حصول آزادی کے وقت حق و باطل کے درمیان ایک نزاع کے طور پر تو قابل قبول تھا لیکن اس کے نتیجے کے طور پر مابعد افسر شاہی کو ایک ایسا میدان ہاتھ لگا جس کے سبب وہ بلاشرکت غیرے حکومت کے مالک بن گئے اور سیاسی جوڑ توڑ اور بد عہدی کے مرتکب ہونے لگے[۱۵]۔ لیکن ان تمام حالات کے باوجود اس نوزائیدہ قوم نے حوصلہ مندی، جرات اور غیرت کا بہترین مظاہرہ کیا، مملکت خداداد پاکستان قائم ہوئی، کاروبار ریاست کا آغاز ہوا، پشاور سے چٹاگانگ تک مسلمان اپنے آپ کو پاکستانی کہنے پر فخر محسوس کرنے لگے اور وہ بھول گئے کہ وہ پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچی یا بنگالی ہیں۔ یہ جذبہ پاکستانی قومیت کا مظہر تھا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد زمام اقتدار ان متلون مزاج، لالچی، اقتدار پرست اور طالع آزما افراد کے ہاتھوں میں چلی گئی جن کے منحوس سائے آج بھی پاکستانی قوم کے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔[۱۶]

۲۶ جولائی ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم محمد علی جناح نے تقسیم ہند کے اعلان (مجریہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کی دفعہ ۲۱ کی ذیلی دفعات ۴ اور ۱۵) کے تحت پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے ناموں کا

اعلان انہیں اراکین سے کیا جو ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات کے ذریعے مرکزی اسمبلی کے لئے منتخب ہوئے تھے۔[۱۷] ملک کے دونوں حصوں کے ارکان اسمبلی کے سیاسی اور سماجی طرز زندگی میں واضح فرق موجود تھا۔ مغربی پاکستان کے تمام صوبوں میں کم و بیش جاگیرداروں کا تسلط تھا۔ پنجاب میں وہی سیاستدان پیش پیش تھے جن کا ماضی بہت حد تک قابل اعتراض رہا تھا' جو برطانوی اقتدار کے استحکام کے لئے پیدا ہوئے تھے' جنہیں خدمات کے عوض برطانوی حکومت نے انعامات سے نوازا تھا۔[۱۸] سندھ جسے باب الاسلام کا درجہ حاصل ہے' وہاں اسلام کوئی طاقت نہ بن سکا اور قیام پاکستان کے وقت بھی یہی کیفیت تھی' یوں سیاسی حالات مسلسل ابتر چلے آرہے تھے۔ بلوچستان جو ہمیشہ کی طرح قرون مظلمہ میں زندگی بسر کرتا آیا ہے اس نے قبائلی عصبیتوں کے آنگن میں انگڑائی لی۔ صوبہ سرحد کو سرخپوشوں نے طویل جدوجہد کے بعد سرزمین بے آئین سے باآئین بنایا لیکن اس کی عوامی روح سیاسی شعور کے تب و تاب کے باوجود کچلی جاچکی تھی۔[۱۹] مشرقی پاکستان کے عوام سیاسی اعتبار سے قدرے باشعور تھے اور وہاں کے سیاستدانوں کی بڑی تعداد وکلاء' اساتذہ اور ریٹائرڈ سرکاری ملازمین پر مشتمل تھی۔ جبکہ متضاد سیاسی پس منظر اور سماجی ماحول سے آنے والے ان ارکان اسمبلی کے لئے لازم تھا کہ وہ پاکستان کے قیام کے اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سرگرم عمل ہوتے اور اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کو ایسا آئین فراہم کرتے جو اس خطے کے عوام کو جمہوری روایات کے فروغ اور غیر مسلم اقلیتوں کو ان کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت مہیا کرتا۔ اس کے برعکس یہ اسمبلی جسے بالغ رائے دہی کے اصول کی بنیاد پر جمہوری اصولوں کے مطابق منتخب نہیں کیا گیا تھا بہت جلد جمہوریت دشمن ادارے میں بدل گئی اور ملک کو بروقت آئین فراہم کرنے میں ناکام رہی۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد مسلم لیگ اقتدار کی سیاست کو اپنا اصل اصول قرار دیتے ہوئے دھڑے بندی کا شکار ہوگئی۔ عوام سے رابطہ منقطع کرتے ہوئے سیاسی سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی اور آزادی اظہار پر پابندیاں عائد کرنا شروع کر دی گئیں۔ سیاستدانوں نے اپنی توجہ اقتدار کو مستحکم کرنے کی جانب مرکوز کی اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ کرنے کی بجائے انگریزوں کے دستور اور قوانین کو مناسب سمجھا۔ البتہ ''توسیع ملازمت کے قوانین نئے بنائے گئے۔ ریٹائرمنٹ کی عمر آگے کرلی۔ خود ہی اپنے آپ کو Extension دے ڈالی''۔[۲۰] یعنی انگریز کے جانے کے بعد نہ جمہوریت آئی نہ کوئی اصلاحات نافذ ہوئیں' صنعتی اور سماجی انقلاب کا تو ذکر ہی کیا' نو آبادیاتی

نظام کے سبھی خرافات بدستور پاکستانی معاشرے میں موجود رہے۔[۲۱] غرضیکہ مسلم لیگ سے وابستہ برسراقتدار طبقے نے، جس کا ماضی میں یونینسٹ پارٹی جیسی مفاد پرست علاقائی جماعتوں سے تعلق تھا، اپنے اقتدار کے فروغ کے لئے ہر غیر جمہوری طریقہ اختیار کیا جس کی بڑی مثال ۱۹۵۱ء میں ہونے والے صوبائی انتخابات کی صورت میں منظر عام پر آئی جو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد ہوئے۔

پنجاب اسمبلی کی ۱۹۷ نشستوں کے لئے آٹھ سو سے زائد امیدواروں نے مسلم لیگ کی ٹکٹ کے لئے درخواست دی۔ جن مفاد پرست افراد کو ٹکٹ نہ ملا انہوں نے جناح عوامی مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتوں کا رخ کیا۔ اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جنہوں نے ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی شہرت کے پیش نظر یونینسٹ پارٹی کو خیرباد کہا تھا۔ پارلیمانی بورڈ نے بھی ٹکٹوں کی تقسیم میں غیر جمہوری طریقہ کار اختیار کیا۔ مثال کے طور پر پارلیمانی بورڈ کے ایک رکن مخدوم زادہ سید حسن محمود نے ملتان سے اپنے رشتہ دار گیلانی پیروں کو ٹکٹ دلوانے میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور ملتان کی تینوں نشستیں سید ولایت حسین گیلانی، سید علمدار حسین گیلانی اور سید رحمت حسین گیلانی کو دے ڈالیں۔[۲۲] ملتان کے علاوہ دیگر بہت سے علاقوں میں ایک ہی خاندان پر ٹکٹوں کی نوازشات کی گئیں مثلاً گوجرانوالہ میں ایک ہی گاؤں فیروز والا کے چوہدری ظفر اللہ خان اور چوہدری نبی احمد کو ٹکٹ دیے گئے۔ ضلع گجرات میں دو سگے بھائیوں نواب زادہ مہدی علی خان اور نواب زادہ کیپٹن اصغر علی خان کو ٹکٹ دیئے گئے۔[۲۳] کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان انتخابات میں ٹکٹوں کی تقسیم کے دوران بڑی بے ضابطگیاں کی گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ کل ۱۴۳ نشستیں حاصل کر سکی اور یہ بھی انتخابی دھاندلیوں کے سبب ممکن ہوا۔ مثال کے طور پر لاہور سے مرزا ابراہیم کے مقابلے میں احمد سعید کرمانی کی کامیابی سرکاری مشینری (قربان علی خان) کی مرہون منت تھی۔ ۲۹ نومبر سے ۱۲ دسمبر ۱۹۵۱ء کے درمیانی عرصہ میں صوبہ سرحد میں صوبائی انتخابات کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہاں بھی مخالف جماعتوں کو، جن میں جناح عوامی لیگ اور سرخپوش تنظیم شامل تھی، دھاندلیوں کا سامنا کرنا پڑا اور عوام کو اپنے رائے دہی کے حق کو آزادانہ استعمال نہ کرنے دیا گیا۔ سندھ میں ۱۹۵۳ء میں صوبائی انتخابات کا اعلان کیا گیا۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں میونسپل انتخابات منعقد ہوئے جو مختلف سیاسی قوتوں کی طاقت کا امتحان تھا۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کے مقابلے میں متحدہ محاذ کے امیدوار اور آزاد امیدوار زیادہ تعداد میں کامیاب ہوئے۔ صوبائی اسمبلی

کے انتخابات سے ذرا پہلے قوم پرست محاذ کے متعدد رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا اور ڈرا دھمکا کر انتخابات سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا گیا۔ ہاریوں کو دھمکیاں دی گئیں کہ اگر انہوں نے متحدہ محاذ کے امیدواروں کو ووٹ دیئے تو انہیں زمینوں سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ مئی ۱۹۵۳ء میں دو مرحلوں میں انتخابات مکمل ہوئے۔ وسیع پیانے پر دھاندلیاں کی گئیں' متعدد پولنگ اسٹیشنوں پر پولنگ کے دوران جعلی ووٹروں کی گرفتاری عمل میں آئی اس طرح منصفانہ اظہار رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔[۲۴] نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ بھاری تعداد میں نشستیں جیت کر اسمبلی میں پہنچ گئی۔

مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کو اس وقت زبردست زک اٹھانا پڑی جب ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انتخابات میں یہ جماعت پچاس فیصد نشستوں سے محروم ہوگئی۔ اگرچہ مشرقی پاکستان میں بھی صوبائی انتخابات ۱۹۵۱ء میں منعقدہ کرنا مقصود تھے تاہم شکست کے خوف سے حکومت ان انتخابات کو معرض التوا میں ڈالتی رہی۔ آخر کار ۸ مارچ ۱۹۵۴ء کو انتخابات عمل میں آئے جن میں کامیابی کے لئے تمام ہتھکنڈے اختیار کرنے کے باوجود مسلم لیگ کو ۳۰۹ نشستوں میں سے صرف نو ۹ نشستیں حاصل ہوئیں۔ اس سے یہ بات واضح طور پر عیاں ہوگئی کہ عوام نے خود غرض' مفاد پرست اور غیر جمہوری طرز عمل اختیار کرنے والے سیاستدانوں کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر دیا تھا۔ لیکن مفاد پرست ٹولے نے اپنی اصلاح کرنے کی بجائے مشرقی پاکستان میں جمہوریت کے خون سے ہولی کھیلتے ہوئے سیکرٹری دفاع میجر جنرل سکندر مرزا کو وہاں کا گورنر بنا دیا جس نے نو منتخب ارکان اسمبلی سمیت جگتو فرنٹ کے سینکڑوں کارکنوں کو جیل بھجوا دیا جبکہ منتخب حکومت اور اسمبلی توڑ کر گورنر راج پہلے ہی نافذ کیا جا چکا تھا۔ اس کے علاوہ وزیر اعلیٰ اور اس کی کابینہ کے ارکان کو نظر بند کر دیا گیا' سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی اور پریس پر سنسر لگا دیا گیا۔ اس قسم کے غیر جمہوری ہتھکنڈوں کے سبب مسلم لیگ کے دور اقتدار میں چند یوم کا اضافہ تو ہوگیا لیکن اس سے متحدہ پاکستان کی عمر کم ہو گئی اور یہ کہ جمہوریت کے ساتھ ساتھ متحدہ پاکستان کے قتل کا سامان بھی ہو گیا۔[۲۵] اس کے بعد اکتوبر ۱۹۵۴ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو غیر جمہوری طریقے سے توڑنے' وفاقی عدالت کی ہدایت پر دوسری آئین ساز اسمبلی[۲۶] منتخب کرنے' محمد علی بوگرہ کی نئی کابینہ میں ایوب خان کو وزیر دفاع اور سکندر مرزا کو وزیر داخلہ مقرر کرنے اور ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور بلوچستان و دیگر ریاستوں کو ملا کر جبری طور پر ون یونٹ

قائم کرنے کے واقعات نے جمہوریت کا مکمل طور پر گلہ گھونٹ دیا۔[27] چودہ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو مغربی پاکستان کا نیا صوبہ معرض وجود میں آیا اور ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء کو وزیر اعظم پاکستان چوہدری محمد علی نے اعلان کیا کہ انتخابات ۱۹ جنوری ۱۹۵۶ء کو ہونگے۔ جبکہ ویسٹ پاکستان ایکٹ ۱۹۵۵ء کے تحت پنجاب، سندھ، سرحد، خیرپور اور بہاول پور کے سابق ارکان اسمبلی کو انتخابی ادارہ قرار دیا گیا جو کہ ایک غیر جمہوری فیصلہ تھا۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ریاست بہاول پور کی اسمبلی جسے ۱۹۵۴ء میں کالعدم قرار دیا گیا تھا، اس کے اراکین کو مغربی پاکستان کی نئی قائم ہونے والی اسمبلی کے بالواسطہ انتخابات کے لئے ووٹ کا حق دیا گیا تھا۔ یہی نہیں ڈاکٹر خانصاحب جنہیں ۱۹۴۸ء میں صوبہ سرحد کے وزارت اعلیٰ کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا تھا، جیل سے رہا کر کے مغربی پاکستان کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ انہیں ۳۱۰ اراکین کے ایوان میں صرف ۵۷ ممبران کی حمایت حاصل تھی۔[28] غرضیکہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے وقت تک غیر جمہوری شعبدہ بازی جاری رہی۔ یہی وہ غیر جمہوری اور سازشی ماحول تھا جس کے باعث فوج کو سیاست میں براہ راست ملوث ہونے، اپنے اقتدار کو طول دینے اور جمہوریت کا گلہ گھونٹنے کا موقع ملا۔ یہاں اس بات کی نشاندہی کرنا بھی ضروری ہے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کے پہلے آئین کے نفاذ کے بعد ملک میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات منعقد کرانا مقصود تھے۔ اس کے لئے پہلے ۱۹۵۷ء اور پھر ۱۹۵۸ء کی تاریخ مقرر کی گئی لیکن انتخابات ایک مرتبہ پھر ملتوی کر دیے گئے اور نئی تاریخ مارچ ۱۹۵۹ء مقرر ہوئی لیکن اس سے پہلے ہی ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ درحقیقت پارلیمانی جمہوریت کا یہ دور سیاسی عدم استحکام اور آئینی بحران کا دور تھا۔ اس تمام عرصے میں ملکی سیاست صوبائی قیود سے باہر نہ نکل سکی اور علاقائی خود مختاری، لسانی تنازعات اور معاشی تفاوت کو بنیادی موضوعات کی حیثیت حاصل رہی۔ اگرچہ منصفانہ انتخابات کے ذریعے قومی یکجہتی کو فروغ دیا جا سکتا تھا مگر فوج اور افسر شاہی کے اثر و رسوخ کے سبب یہ احکامات، معدوم پڑ چکے تھے۔ حکمران یہ محسوس کرنے سے قاصر تھے کہ ملک کے سیاسی مسائل کا حل فوجی مداخلت کی بجائے جمہوری عمل کے فروغ اور سیاسی اداروں کی بالادستی میں مضمر ہوتا ہے، ایسے ادارے جن میں عوام کو موثر شرکت کا احساس ہو اور وہ یہ سمجھیں کہ وہ اپنی تقدیر کے خود مالک ہیں۔ عوام نے اسی خواب کی تکمیل کے لئے یہ وطن عزیز حاصل کیا تھا اور یہی احساس مضبوط پاکستان کی ضمانت ہے۔[29]

۱۹۶۲ء میں ایوب خان کی قیادت میں دوسرا آئین تشکیل دیا گیا جس میں بالواسطہ طریق انتخابات اختیار کیا گیا اور بنیادی جمہوریتوں کا نظام متعارف کرایا گیا' جس کے تحت بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عوام نے بلدیاتی اداروں کے ارکان کو منتخب کرنا تھا اور ان اسی ہزار نمائندوں نے صوبائی و قومی اسمبلی کے ممبران اور صدر مملکت کا انتخاب عمل میں لاتا تھا۔ اگرچہ ایوب خان ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء تک برسراقتدار رہے لیکن وہ بھی ملک و قوم کو اصل اغراض و مقاصد سے ہمکنار کرنے میں ناکام رہے کیونکہ وہ لوگ جن سے بیگار لی جاتی ہے انہیں بنیادی جمہوریت کا ووٹر تو بنا لیا گیا لیکن انہیں بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ نتیجہ لوگوں کے احتجاج اور سڑکوں پر نمودار ہونے کی صورت میں نکلا۔ یہی کہ "تھوڑی بہت جمہوریت آئی تو ہمیں کچھ عقل بھی آئی۔ کم از کم لفظ جمہوریت کی شعبدہ گری کا اندازہ ہوا۔ فیوڈل جمہوریت اور بورژوا جمہوریت کے ساتھ فوجی جمہوریت کا اضافہ صرف ہمارے ملک میں ہوا"۔[۳۰] شاید عوام اب یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ معاشی آزادی جمہوریت کی اصل بنیاد ہوتی ہے۔ اگر معاشی آزادی نہ ہو تو جمہوریت کس کام کی ؟ نو آبادیاتی دور میں اگرچہ اقتدار اعلیٰ انگریز حکومت کے تصرف میں تھا تاہم علاقائی سیاست و حکمرانی جاگیرداروں اور سجادہ نشینوں کے ہاتھوں میں تھی۔ قیام پاکستان کے بعد متوسط طبقے کے حالات قدرے بہتر ہوئے تھے لیکن محنت کش طبقے کو ایک عرصہ گزرنے کے باوجود دو وقت کی روٹی کمانے کی آزادی' تن ڈھاپنے کے لئے کپڑا اور گرمی' سردی سے بچنے کے لئے چھت تک میسر نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک مزارعے' ایک چھان بورہ بیچنے والے اور کوڑے کے ڈھیر سے روٹی کے ٹکڑے چن کر پیٹ بھرنے والے محکوم افراد کو برطانوی راج کی غلامی اور کالا باغ کی جمہوریت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ ایوب خان کے خلاف تحریک کے دوران ایک پر فریب نعرہ لگایا گیا کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اور ان کی اجتماعی خواہشات اور ضروریات کا تحفظ یا احترام حکومت کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہوتا ہے۔ لیکن عملی طور پر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جمہوریت لوگوں کے لئے نہیں بلکہ لوگوں کے خلاف سودے بازی کے لئے ہوتی ہے۔

یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد لیگل فریم ورک آرڈر کے نام سے ایک آئینی فارمولا جاری کیا جس کے تحت قیام پاکستان کے تئیس برس بعد پہلے عام انتخابات کرانے اور پارلیمانی جمہوری نظام قائم کرنے کا اعلان کیا۔ ون یونٹ کو ختم کردیا گیا اور ایک فرد ایک ووٹ کا قانون دوبارہ رائج کیا

گیا۔ پروگرام کے مطابق قومی اسمبلی کے انتخابات ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ۱۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو منعقد ہوئے۔ اگرچہ انتخابات فوج کی نگرانی میں ہوئے لیکن نتائج کے اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ ملک کے غریب اور محنت کش عوام نے ان انتخابات میں بڑی دلچسپی لی کیونکہ انہیں پہلی مرتبہ طاقت کا سرچشمہ قرار دیا گیا تھا۔ ووٹ صرف ان جماعتوں کو ملے جنہوں نے عوام کی طاقت پر بھروسہ کیا تھا اور اپنے اپنے منشور میں محنت کش کو انسان تسلیم کرتے ہوئے ان کی بنیادی ضروریات یعنی روٹی، کپڑا اور مکان کی ضرورت کا احساس کیا تھا۔ نتائج سے یہ بات واضح طور پر عیاں تھی کہ عوام کو پہلی مرتبہ ووٹ کے آزادانہ استعمال کا موقع ملا اور انہوں نے پرانی سیاست گری کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ ایک پریذائڈنگ آفیسر نے لاہور شہر کے ایک پولنگ سٹیشن پر ووٹ ڈالنے والے افراد کا منظر کچھ اس طرح پیش کیا کہ ووٹروں کی قطاروں پر نگاہ ڈالی تو امراء، شرفا کا نام تک نہیں تھا اور عوام ہجوم در ہجوم آگے بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرح اپنا فیصلہ دینے کو بے چین تھے اور پر عزم۔ یہ غریب مفلس گھرانوں کی عورتیں تھیں۔ ہڈیوں کے ڈھانچے، جسم میلے، بوسیدہ چیتھڑے، بچے انگلی لگے گود میں اٹھائے ہوئے ووٹ ڈالنے کو سویرے ہی آگئی تھیں۔ ایکدم سے پولنگ اسٹیشن کا کمپاؤنڈ بھر گیا مگر وہ چلی آرہی تھیں، ان کا انت کوئی نہیں تھا۔ کام کرنے والے عملے کا دم گھٹنے لگا مگر ووٹر ووٹ ڈال رہے تھے وہ ہم سب پہ نگاہ بھی رکھ رہے تھے۔[۳۱] المختصر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں عوام نے آزادانہ طور پر اپنے ووٹ کا استعمال کرتے ہوئے جاگیردارانہ نظام اور اسلامی جماعتوں کو مکمل طور پر رد کر دیا تھا۔ وقت کی ستم ظریفی یہ کہ چوہدری، سردار اور وڈیرے اپنے مزارعوں، صنعت کار مزدوروں اور سجادہ نشین اپنے مریدوں سے شکست کھا گئے تھے۔[۳۲] مگر عوام کی یہ جیت عارضی ثابت ہوئی۔ یہ کوئی انقلاب نہیں تھا محض ووٹ کی قیمت تھی ورنہ جو قومیں ان انتخابات میں شکست سے دوچار ہوئیں وہ تمام تر ذرائع کی مالک تھیں۔ وہ تو مزدوروں اور کسانوں کو اپنے گھر کے فیصلے خود کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ لہٰذا اس فیصلے کو کیسے تسلیم کر سکتی تھیں جبکہ یہ نتائج خود فوجی حکمرانوں کی امیدوں کے بھی برعکس تھے۔

مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کو واضح کامیابی حاصل ہوئی اور ان کی جماعت پیپلز پارٹی نے اکیاسی نشستیں حاصل کیں۔ لیکن مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے ۱۶۰ نشستیں جیت کر نمایاں کامیابی

حاصل کی۔ لیکن خود غرض سیاستدانوں نے اپنے اپنے اقتدار کے لئے پاکستان کو دو لخت کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ جہاں تک نئے پاکستان کے نئے قائد کا تعلق تھا اگرچہ وہ ہوشیار اور دلیر تھا مگر عوام میں سے نہیں تھا اپنے فیوڈل پس منظر کی بنا پر تاریخی عمل کو بجا طور پر سمجھنا اور تسلیم کرنا اس کے لئے ممکن اس لئے نہیں تھا کہ یہ بات اس کے طبقاتی مفاد سے متصادم تھی۔ لہٰذا تھوڑے ہی عرصے میں افسر شاہی، پولیس اور عوام دشمن قوانین نے عوام کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ نئے قائد نے اپنے مخصوص سیاسی پس منظر کے تحت رجعت پسندی کی مٹی پر ترقی پسندی کا کھلونا تیار کیا، اسے مقبول عام نعروں سے سجایا، لوگوں کے مسائل، ان کی خواہشات اور خوابوں کے نام پر ووٹ حاصل کئے لیکن بعد ازاں نتائج سے یہ عیاں ہوا کہ یہ سب کچھ اقتدار کی خاطر کیا گیا تھا۔[۳۳] یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک استحصالی نظام کی موجودگی میں کوئی حکمران غریب عوام کو دے بھی کیا سکتا تھا؟ لہٰذا حکمران بننے کے بعد بھٹو غریب عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان جیسی کسی بھی نعمت سے ہمکنار نہ کر سکے۔ اسی کیفیت میں وقت گزرتا گیا اور امید و یاس کی ملی جلی صورت میں ۱۹۷۷ء کے انتخابات منعقد ہوئے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء تک کیا ہوا؟ صرف ووٹر کے جذبات میں افسردگی کا عنصر، باقی حالات وہی رہے۔ قطاروں میں لگے یہ رائے دہندگان جیسے غلاموں کی کھیپ بیگار پر جا رہی ہو، ایک مرتبہ پھر اپنا جمہوری حق استعمال کرنے کے لئے آئے تھے۔ جمہوریت کیا ہوتی ہے؟ آمریت کے کیا معنی ہیں؟ ان دونوں کا فرق یہ کیا جانیں۔ اس مرتبہ نتیجہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے حق میں نکلا۔ اس کی وجہ یہ کہ ذوالفقار علی بھٹو جو عوامی قائد ہونے کا دعوی کرتے تھے افسر شاہی کے ہاتھوں مافوق الفطرت شخصیت کے طور پر ابھرنے کے ناطے پرانے، خود غرض اور اقتدار کی ہوس کے بھوکے سیاستدانوں میں گھر چکے تھے۔ اگرچہ وہ انتخابات بھاری اکثریت سے جیت گئے تھے لیکن مخالف جماعتوں کی جانب سے انتخابات میں دھاندلی، بددیانتی اور سرکاری مشینری کو استعمال کرنے کے الزامات عائد کئے گئے۔ مخالف جماعتوں نے متحدہ محاذ[۳۴] قائم کیا۔ اور حکومت کے خلاف عوامی تحریک چلائی گئی جس کا نتیجہ چار اور پانچ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب تیسرے مارشل لاء کی صورت میں نمودار ہوا "جسے آپریشن فیئر پلے" کا نام دیا گیا۔[۳۵]

۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۵ء کے درمیانی عرصہ میں ملک و قوم جنرل محمد ضیاء الحق کی قیادت میں مارشل لاء کے تابع رہے۔ اس عرصہ کے دوران شورائی نظام نافذ کرنے اور اسے قانون سازی کے اختیارات

تفویض کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۳ء میں بلدیاتی انتخابات منعقد ہوئے جو ذات، برادری اور مقامی گروہ بندی کی بنیاد پر لڑے گئے۔ حکومت نے ان انتخابات کو پیمانہ بنا کر عوام کے ذہنوں کی سیاسی جہت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ یہ کہ اگر مرکزی اور صوبائی سطح پر انتخابات منعقد کرائے جائیں تو ان سے کیا نتائج برآمد ہونگے؟ دسمبر ۱۹۸۴ء میں صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کی توثیق و تصدیق کی خاطر صدارتی استصواب رائے کرانے کا فیصلہ کیا جس کے تحت ۱۹۹۰ء تک برسراقتدار رہنے کا اختیار حاصل کر لیا۔ جنرل ضیاء الحق نے ایم آر ڈی[۳۶] کی احتجاجی تحریک کے نتیجے کے طور پر فروری ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کیا۔ یہ جمہوری اداروں کی تشکیل کا ایک نیا تجربہ تھا۔ انتخابات غیر جانبدارانہ ماحول میں منعقد ہوئے اور عوام نے انہیں غنیمت جان کر بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ ان انتخابات نے سیاست کو تازہ خون دیا کیونکہ منتخب ہونے والے اراکین کی بھاری تعداد آزادی کے بعد پیدا ہونے والی نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے باوجود ارکان کی اکثریت ان ہی خاندانوں پر مشتمل تھی جو ہمیشہ برادری سسٹم، نسلی و گروہی عصبیت اور دولت کے بل بوتے پر اسمبلیوں تک پہنچتے رہے اور ضرورت کے مطابق اپنی وفاداریاں بدلتے رہے تھے کیونکہ ان کے نزدیک سیاست پابند وفا نہیں تھی۔ لہٰذا جب حکومت کی جانب سے اشارہ ہوا تو بہت سے منتخب ارکان نے محمد خان جونیجو کا ساتھ دیا اور مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔[۳۷] اگرچہ جونیجو ذاتی طور پر جمہوری سوچ کے مالک تھے اور آمریت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ضیاء الحق نے اس منتخب مرکزی اسمبلی سے بھی مارشل لاء کا کام لیا یعنی آٹھویں ترمیم کی منظوری لے کر اپنی صدارت کے لئے ضروری اختیارات حاصل کر لیے۔ اس کے باوجود یہ اسمبلی اور وزیر اعظم جمہوری عمل کی بقاء کے لئے ایک ڈھال تھے۔ ان انتخابات کا ایک منفی پہلو یہ بھی تھا کہ سیاست میں دولت بنانے کا رجحان شدت اختیار کر گیا تھا۔ انسان گھوڑے بن گئے اور فروخت ہونے لگے نتیجہ یہ نکلا کہ اسمبلیاں اپنی آئینی معیاد پوری کرنے سے قبل ہی توڑ دی جانے لگیں۔[۳۸] لہٰذا ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو اچانک ضیاء الحق نے اسمبلیاں برخاست کر دیں اور جونیجو کو برطرف کر دیا۔ عوام کی یہ توقعات یکسر غلط ثابت ہوئیں کہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے لئے کام کیا جارہا ہے اور ان کے بنیادی حقوق واپس لوٹا دیے جائیں گے۔ ابھی عوام جمہوریت کے مستقبل کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ۱۷

اگست ۱۹۸۸ء کو ضیاء الحق طیارے کے حادثے کے سبب دنیا فانی سے کوچ کر گئے اور ان کا گیارہ سال ایک ماہ اور بارہ دن کے عرصے پر محیط دور اپنے اختتام کو پہنچا۔

قومی اسمبلی کے نئے انتخابات ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کو جماعتی بنیادوں پر منعقد ہوئے جن میں کسی ایک سیاسی جماعت کو واضح اکثریت حاصل نہ ہو سکی۔ بہرحال بے نظیر بھٹو مرکز میں حکومت بنانے میں کامیاب رہیں۔ ان کے گرد مفاد پرست سیاستدان بدستور موجود رہے۔ اگرچہ غریب پارٹی ورکرز نے ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران جمہوریت کی بحالی کی خاطر جدوجہد کرتے ہوئے جان کی بازی تک لگا دی تھی، جمہوریت کی برکتوں سے کسی طور بھی مستفید نہ ہو سکے۔[۳۹] جمہوریت بدستور سازشوں کا شکار رہی، بنیاد پرستوں سے لے کر رجعت پسندوں اور موقع پرستوں تک سبھی اس کھیل میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ وہ تمام جمہور دشمن قوتیں جو دور غلامی سے ورثے میں ملی تھیں یعنی پولیس، فوج، بیوروکریسی، ایف آئی اے، انٹر سروسز جیسی ایجنسیاں، جاگیرداری کا سازشی اور استحصالی نظام"[۴۰] سیاست میں جوڑ توڑ اور خرید و فروخت، کرپشن اور ناجائز اسلحہ کی بھرمار اور وڈیرہ شاہی ذہنیت کی وجہ سے جمہوریت کیسے فروغ پا سکتی تھی۔ ان حالات میں بے نظیر بھٹو کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسٹیٹ پاور ایک مرتبہ پھر حرکت میں آئی اور ستمبر ۱۹۸۹ء میں فوج اور غلام اسحاق خان نے کوشش کی کہ ایوان کے اندر ہی سے تبدیلی لا کر بے نظیر کو فارغ کر دیا جائے۔اس سازش کو انٹیلی جنس بیورو نے "آپریشن مڈنائٹ جیکال" کے نام سے موسوم کیا۔ تاہم ان کوششوں کا اختتام ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے توڑنے سے ہوا۔[۴۱] ۲۴ اور ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو علی الترتیب قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے اور میاں محمد نواز شریف کی قیادت میں مسلم لیگ کو واضح برتری حاصل ہوئی۔ اگرچہ عوام کے اس فیصلے سے جمہوریت کے اس بنیادی اصول کی توثیق ہوگئی کہ ملک کے اصل حکمران عوام ہیں اور وہ جب چاہیں حکمرانی کا حق واپس لے سکتے ہیں جو منتخب نمائندوں کو محض امانت کے طور پر سونپا گیا تھا۔[۴۲] لیکن جیتنے والوں کی اکثریت تو ان ہی خاندانوں اور ان کے عزیزو اقارب پر مشتمل تھی جو ابتداء ہی سے ملک پر قابض چلے آرہے تھے۔ اگرچہ خفیہ سروس کے اداروں اور اسٹیبلشمنٹ نے اس تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن یہ ادارے بھی موجودہ حکومت کو آٹھویں ترمیم سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ لہٰذا صدر مملکت اور محمد نواز شریف کے درمیان اختلافات کے سبب ۱۸ اپریل ۱۹۹۳ء کو

اس حکومت کی بھی چھٹی کر دی گئی۔ سپریم کورٹ کی جانب سے حکومت کی بحالی کے باوجود جمہوری ادارے کام کرنے سے قاصر رہے۔ محمد نواز شریف نے بذات خود اقتدار سے علیحدہ ہونے کا اعلان کیا۔ یہ سب کچھ کیوں اور کس کے ایماء پر ہوا اس سے پوری قوم بخوبی آگاہ ہے۔ قصہ مختصر علی الترتیب ۶ اور ۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات دوبارہ منعقد ہوئے[۴۳] اور ایک مرتبہ پھر پی۔ڈی۔اے کی قیادت کرتے ہوئے، بے نظیر کو حکومت بنانے کا موقع ملا۔ لیکن کرپشن، دھاندلی اور افراتفری کے الزامات کے سبب یہ حکومت بھی اپنی معیاد پوری نہ کر سکی اور اس سے قبل ہی ۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو صدر فاروق لغاری نے قومی اسمبلی کو توڑ دیا۔ ۳ فروری ۱۹۹۷ء کو نئے انتخابات کا انعقاد عمل میں آیا جن میں رائے دہندگان نے اپنے ووٹ کا آزادانہ استعمال کرتے ہوئے ایک تاریخ ساز فیصلہ صادر کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ اگر عوام چاہیں تو اپنے آقاؤں کا احتساب کر سکتے ہیں۔[۴۴] احتساب تو ہوا لیکن ایک جماعت کی حد تک، خاندانوں کی حد تک نہیں کیونکہ اس مرتبہ بھی ان ہی لوگوں کی اکثریت اسمبلیوں میں گئی ہے جو پہلے بھی اس ملک کے مقدر کے مالک رہے ہیں۔[۴۵]

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے اسلامی جذبات سے سرشار، بے شمار قربانیوں کے بعد یہ ملک اپنی مذہبی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے اور ملت اسلامیہ کی مادی و روحانی تعمیر و ترقی کی غرض سے حاصل کیا تھا۔ یعنی یہاں ایک ایسا جمہوری نظام نافذ العمل کیا جانا مقصود تھا جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہو۔ جیسا کہ ۱۹۴۳ء میں قائد اعظم محمد علی جناح نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''جمہوریت ہمارے خون میں شامل ہے۔ یہ ہماری رگ رگ میں رچی ہوئی ہے''۔ بہرحال ایک ایسے اسلامی معاشرے کی تشکیل کا تصور پیش کیا گیا تھا جس کے ذریعے مساوات کے سنہری اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے پوری قوم کے بنیادی حقوق اور مفادات کو اولین ترجیح دی جانا مقصود تھی۔ لیکن تقسیم ہند سے ۳ فروری ۱۹۹۷ء تک کی انتخابی تاریخ کا مختصر جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مطلوبہ مقاصد کا حصول تو کجا ہم وہ بنیادی اصول بھی وضع نہیں کر پائے جن پہ چلتے ہوئے اسلامی جمہوری اقدار کے حصول کے عمل کا آغاز ممکن بنایا جا سکتا تھا۔ زیر بحث مضمون میں ان تمام عوامل کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا جو مطلوبہ جمہوری عمل کو آگے بڑھانے میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوئے۔ مثلاً جاگیرداروں اور سجادہ نشینوں کے علاوہ فوج اور بیوروکریسی کے کردار یا عمل دخل کو بھی مدنظر رکھنا

ہوگا۔ ماضی میں سیاستدانوں کے منفی رویوں کی وجہ سے کئی دساتیر اور مختلف طرز کی حکومتیں بنانے کے تجربات کئے گئے لیکن ملک و قوم کی بجائے ذاتی مفادات سے لگاؤ اور خلوص نیت کے فقدان کے سبب یہ تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ سیاسی عدم استحکام کا یہ عالم کہ مارشل لاء کا کل ۲۱ یا ۲۲ سالہ دور نکال کر بقیہ مدت میں تقریباً" ۱۴ وزراء اعظم منتخب و مسترد ہوئے۔ جماعتی اور غیر جماعتی غرضیکہ ہر طرز کی اسمبلیاں ترتیب دی گئیں۔ دھاندلی والے اور منصفانہ انتخابات بھی منعقد ہوئے۔ صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے کئی تجربات بھی کئے گئے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر تجربات کرنے کے باوجود ہم ابھی تک عدل و انصاف پر مبنی جمہوری نظام حکومت، جس میں پوری قوم کو برابری کی سطح پر مساوات محمدی ﷺ کے ناطے یکساں حقوق حاصل ہوں، کیونکر قائم نہیں کر سکے اور وطن عزیز کو قومی دولت لوٹنے والوں سے محفوظ رکھتے ہوئے، بیرونی قرضوں سے نجات دلواتے ہوئے (جو ناعاقبت اندیش حکمرانوں کی ذاتی تجوریاں بھرنے کے لئے حاصل کئے گئے) ایک ترقی یافتہ ملک میں کیونکر نہیں بدل سکے ؟ دراصل قائد کے انتقال کے فوراً" بعد اس ملک پر خود غرض، مفاد پرست، طالع آزما یونینسٹ ذہنیت کے مالک افراد کی گرفت انتہائی مضبوط ہوگئی تھی۔ یہ مفاد پرست ٹولہ وقت اور ضرورت کے تحت رنگ بدلتا رہا۔ شہروں کے نزدیک ان کی جاگیریں، پلازوں اور ہاؤسنگ سوسائٹیوں میں تبدیل ہونے لگیں، حکومتی عہدوں پر فائز رہتے ہوئے بھی کچھ کم لوٹ کھسوٹ نہ کی تھی لہٰذا جاگیردار ہونے کے ناطے صنعت کار بھی بن گئے۔ اس طرح مزارعین اور کمیوں کے علاوہ مزدور اور محنت کش طبقہ، سبھی ان کے ووٹر ٹھہرے۔ پاکستان کے مخصوص معاشرتی اور معاشی تقاضوں بالخصوص دیہی علاقوں کے سماجی حالات کے سبب جمہوریت اور نمائندگی کے اصولوں یا مفہوم کی تلاش ایک بے سود کوشش ہوگی جس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ ۱۹۳۷ء سے انتخابات میں پشت در پشت وہی سجادہ نشین اور جاگیردار گھرانے مخصوص آبائی نشستوں سے منتخب ہوتے چلے آرہے ہیں۔ ان کی اس معاشرتی اور سیاسی حیثیت کے سامنے سیاسی جماعتیں بھی مجبور محض ہیں اور انتخابات میں ان مخصوص خاندانوں کو امیدوار بنائے بغیر فتح کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ سوشل ازم کی بنیاد پر وجود میں آنے اور غریبوں کا دم بھرنے والی جماعت بھی ۱۹۷۷ء میں اس طبقے کے بغیر اپنے آپ کو انتخابات جیتنے کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے علاوہ ہر حال میں برسراقتدار رہنا

بھی اس طبقے کی ایک بہت بڑی مجبوری رہی ہے۔ کیونکہ اپنے اپنے دیہی علاقے میں سرداری قائم رکھنے اور ذاتی مفادات کی حفاظت کے لئے ان وڈیروں کو حکومتی اداروں مثلاً" تھانہ، کچہری اور محکمہ مال کے عملے کی حمایت کی ضرورت رہتی ہے لہٰذا وہ ہمیشہ جماعت سے زیادہ حکومت کے وفادار رہنا پسند کرتے ہیں اور حزب اختلاف میں بیٹھنے کے متحمل نہیں۔ مختصر یہ کہ یہ طبقہ کبھی کسی نظریے، کسی منشور، کسی پارٹی پروگرام یا کسی قومی نصب العین کا پابند نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان خاندانوں اور قبیلوں کے افراد بیک وقت متضاد نظریات رکھنے والی جماعتوں کے سرگرم رکن رہے ہیں تاکہ اقتدار کی مجلس جو بھی جماعت سجائے اس میں انہیں ضرورت کے مطابق نمائندگی حاصل ہو۔[۴۶] اگر ہم ۱۹۵۸ء سے پہلے کی اسمبلیوں پر نگاہ ڈالیں تو جاگیرداروں اور چند صنعت کاروں کے علاوہ کوئی اور طبقہ سیاست میں پیش پیش نظر نہیں آتا۔ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۷ء کے درمیانی عرصہ میں پانچ مرتبہ عام انتخابات منعقد ہوچکے ہیں۔ جبکہ اپنی مدت سے پہلے اسمبلیاں ٹوٹنے اور بار بار انتخابات کے انعقاد کی بڑی وجہ احساس قومیت کا فقدان یعنی قومی خزانے کی لوٹ کھسوٹ، سیاسی بدامنی اور انتشار قرار دی جاتی رہی ہے۔ جہاں تک اس پورے دورانیہ میں منتخب ہونے والے افراد کے حسب نسب کا معاملہ ہے، محض چند خاندانوں کی اجارہ داری رہی ہے۔ لہٰذا انتخابی نتائج دیکھ کر ہر ذی شعور فرد کے ذہن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ سیاسی وراثت کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا ؟ ان اجارہ داریوں کا زور کب ٹوٹے گا ؟ عوام کے صحیح نمائندے کب ایوانوں میں پہنچ پائیں گے ؟ فی الحال یہی جواب دیا جا سکتا ہے کہ اگر مقتدر حلقوں کی ترجیحات اور سیاسی جماعتوں کا طرز عمل اسی طرح روایتی طور طریقوں کا مرہون منت رہا تو شاید آئندہ کئی سالوں تک اصلاح احوال کے امکانات ناپید رہیں گے کیونکہ سیاستدانوں کی نااہلی کے سبب فوج اور بیوروکریسی کو سیاست میں دخیل ہونا پڑا اور اس طرح محلاتی شازشوں نے جنم لیا اور نتیجہ مارشل لاء حکومتوں کی صورت میں رونما ہوا اور جمہوریت محض ایک خواب تک محدود رہی ہے۔ بلا شبہ مفاد پرست سیاستدانوں کے غیر جمہوری کردار کے سبب ابتداء سے فوج اور بیوروکریسی کو حکومتی امور میں عمل و دخل کا موقع ملا۔ جہاں تک فوجی مداخلت کا معاملہ ہے قیام پاکستان کے بعد ابتدائی چوبیس سالوں میں سے ۱۷ برس تک میجر جنرل سکندر مرزا، محمد ایوب خان اور یحیٰی خان بلا شرکت غیرے اقتدار پر قابض رہے اور جمہوری عمل کو آگے بڑھانے میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات

کے بعد جہاں اس قوم کو سقوط ڈھاکہ کی صورت میں ایک بڑے سانحے سے دوچار ہونا پڑا وہاں جب حسرت و یاس کی کیفیت میں اقتدار ایک عوامی جماعت کو منتقل ہوا تو ایک موہوم سی امید پیدا ہوئی کہ اب جمہوری عمل آگے بڑھے گا اور آہستہ آہستہ جمہوریت کا یہ پودا ایک تناور درخت بنے گا۔ لیکن جمہوریت کے اس پودے کی آبیاری میں آمریت کے زہر کی آمیزش تھی لہٰذا جمہوریت کے اس نوزائیدہ پودے کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لئے جرنیل اور خفیہ ایجنسیاں حالات کی مجبوری کا بہانہ بنا کر' اور کبھی حالات کو سیاستدانوں اور ان دیکھے ہاتھوں کے ذریعے خراب کرکے سیاست کے اکھاڑے میں اترتی رہیں۔ بھٹو دور میں آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل غلام جیلانی خان اور انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ راؤ عبدالرشید کا کردار اہم رہا ہے۔ کچھ نقادوں کے مطابق ضیاء الحق کا کمانڈر انچیف کے منصب پر فائز ہونا ایک سازش کا حصہ تھا اور اس سازش کی کامیابی میں کئی پس پردہ ہاتھوں نے اہم کردار کیا۔ [۴۷]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر کسی بھی ملک میں موجود سیاسی جماعتیں اپنے اپنے منشور پر دیانتداری سے عمل کریں تو سیاسی عمل میں پختگی پیدا ہوسکتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ابھی تک کوئی بھی جماعت ایسا کرتے ہوئے قومی ضروریات یا عوامی خواہشات کی ترجمان ثابت نہیں ہوئی ہے جبکہ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۷ء تک منعقد ہونے والے انتخابات سے یہ حقیقت آشکارہ ہوچکی ہے کہ تمام کمزوریوں کے باوجود مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی ہی دو ایسی جماعتیں ہیں جن کے درمیان اقتدار کی منتقلی ہوتی رہی ہے۔ فی الحقیقت یہ دونوں جماعتیں انقلابی رجحانات کی حامل نہیں رہی ہیں۔ مزید یہ کہ ماضی میں یہ دونوں جماعتیں ملٹی کلاس رہی ہیں۔ لہٰذا عملی طور پر عوامی جماعتوں کا کردار ادا نہیں کرسکیں۔ کیونکہ کسی ایک فرد یا جماعت کے قائد کے جمہوریت پسند یا عدل و انصاف کا قائل ہونے کے سبب کوئی جماعت جمہوری یا عوامی جماعت میں نہیں بدل جاتی بلکہ سالہاسال کی محنت کے بعد ہی کسی جماعت کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ ابتداء میں ظاہری طور پر پیپلزپارٹی' مسلم لیگ سے ایک مختلف جماعت نظر آتی تھی۔ اس جماعت کی قیادت عوام کے لئے دلکش اور منشور' بے کس انسان کے لئے نئی زندگی کا پیغام تھا۔ لیکن بہت جلد مسلم لیگ کی طرح اس جماعت پر بھی وڈیروں اور جاگیرداروں نے قبضہ جما لیا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے انگریز کے بعد ملک کی باگ ڈور سنبھالی تھی اور آمرانہ ذہنیت کے سبب کہیں آئین کی تشکیل نو تو کہیں زرعی اصلاحات کی راہ میں حائل ہوئے۔ جب ۱۹۷۰ء کے انتخابات

کے نتیجے میں پیپلز پارٹی برسراقتدار آئی اور اس نے اپنے منشور کے مطابق زرعی اصلاحات کا بیڑہ اٹھایا اور مزارعین نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھنے کی کوشش کی تو یہی جاگیردار آڑے آئے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے جوق در جوق پیپلز پارٹی میں شامل ہونے لگے۔ نتیجہ یہ کہ زرعی اصلاحات کا نفاذ عملی طور پر ممکن نہ ہوسکا۔ علاوہ ازیں اسی پارٹی کے دور میں مزدوروں پر گولی چلی اور مزارعین کے حقوق پامال کئے گئے۔ لہٰذا اس طرح پیپلز پارٹی یا کسی اور رجعت پسند جماعت میں کوئی فرق نہ رہا۔ ۱۹۷۰ء کے شکست خوردہ جاگیردار ہی ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کی ٹکٹ پر پیش پیش تھے۔ ایسا کیوں ہوا اس کا جواب پیپلز پارٹی کی قیادت شاید عوام کو کبھی نہ دے سکے۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ اگرچہ ووٹ کی طاقت اس وقت بھی ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ میں تھی اور جب مخالفین نے اس جماعت کی فتح کو دھاندلی قرار دے کر نتائج قبول کرنے سے انکار کیا تو ذوالفقار علی بھٹو اپنے اصل کارکنوں کی حوصلہ شکنی اور تائید و حمایت کے فقدان کے سبب مخالفت کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے۔ لیکن اس کے باوجود ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک اگر کسی نے مزاحمت کی تو وہ پیپلز پارٹی کے کارکن تھے، اگرچہ وہ غیر منظم اور حقیقی سرپرستی سے محروم تھے۔ دوسری جانب اس پورے دورانیہ میں پیپلز پارٹی کو ہائی جیک کرنے والے وڈیروں، سجادہ نشینوں اور جاگیرداروں کا کہیں کھوج نہ ملا۔ یعنی جب پیپلز پارٹی پر برا وقت آیا تو یہ سب اپنے محلات تک محدود ہوگئے۔ جبکہ ان ہی کارکنوں نے ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۳ء تک منعقد ہونے والے انتخابات میں بے نظیر بھٹو کو اپنے قائد کی تصویر جان کر دل و جان سے مدد کی لیکن جب بھی فائدہ پہنچانے کا وقت آیا تو ان ہی پیشہ ور سیاستدانوں کو نوازا گیا۔ یہاں یہ بات واضح کردینا بھی ضروری ہے کہ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۷ء تک جتنے بھی انتخابات ہوئے یہی مخصوص طبقہ کبھی ادھر کبھی ادھر، دونوں جماعتوں میں پیش پیش نظر آتا ہے۔ یہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک متبادل انتظام کے طور پر اختیار کی گئی حکمت عملی ہے۔[۴۸] ان حالات میں ملک کے محکوم طبقات رائے دہندگان کی حیثیت سے اپنے حاکموں کے ارادوں کو ناکام بنانے میں کیسے کامیاب ہوسکتے ہیں۔

پاکستان میں اگر ابتداء ہی سے جمہوری طریقوں پر خلوص نیت سے عمل کیا جاتا تو یقیناً آج یہاں ایک مثالی فلاحی معاشرہ قائم ہوچکا ہوتا۔ کسی بھی ملک میں انتخابات کا مقصد، ملک کی سیاسی جماعتوں،

سیاسی راہنماؤں اور رائے دہندگان کے توسط سے ایسے نمائندہ ادارے وجود میں لاتا ہوتا ہے جن کی مدد سے نمائندہ جمہوریت قائم ہوسکے اور عوام کے منتخب نمائندے قانون ساز اداروں میں بیٹھ کر قومی امنگوں اور خواہشات کے مطابق ایسے قوانین بنائیں اور ایسے منصوبے تشکیل دیں جن پر عمل پیرا ہوکر دیہی علاقوں سے مرکز کی سطح تک منتخب، بامقصد اور فعال ادارے قائم کئے جائیں جو پورے ملک کو ترقی اور خوشحالی کی ضمانت فراہم کریں اور جس کے نتیجے میں ملک غیر ملکی قرضوں کے حصول کی پالیسی کو ترک کرکے خود انحصاری کی منزل کی جانب گامزن ہوسکے۔ اس کے علاوہ آئین اور قانون کی حکمرانی کا ایک ایسا نظام رائج کیا جائے جس کی موجودگی میں نہ کبھی آئین منسوخ کرنے اور نہ قانون ساز اداروں کو توڑنے کی ضرورت پیش آئے اور نہ فوج یا بیوروکریسی کو حکومتی امور میں مداخلت کی ضرورت پیش آئے۔ برسراقتدار آنے والی جماعتوں اور ان کے راہنماؤں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ملک کو ایسی فلاحی ریاست میں بدلنے کی کوشش کریں جس میں ہر شہری کی عزت و آبرو محفوظ ہو اور برابری کی بنیاد پر ہر فرد کو انصاف اور روزگار کے مواقع میسر ہوں اور ایسے صحت مند معاشرے کو جنم دیا جائے جو غربت و افلاس، جہالت، بیماری اور ذہنی پسماندگی سے پاک ہو۔ جہاں امیر و غریب کے درمیان نفرت کی خلیج کو ختم کیا جائے، شہری اور دیہاتی کا فرق مٹایا جائے، اور صوبائی، علاقائی اور نسلی عصبیت کا خاتمہ کیا جائے۔

انتخابی عمل کو عوامی امنگوں کا آئینہ دار بنانے کے لئے ضروری ہے کہ عوام کی معاشی اور معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے اور جان و مال کا تحفظ فراہم کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں۔ ہماری ماضی کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہمارے ملک کا معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ بہت حد تک جمہوریت کی راہ میں حائل رہا ہے۔ ایسے ممالک جو ابتداء سے معاشی بحران کا شکار رہے ہوں وہاں خواندگی کی شرح کبھی بہتر نہیں ہوتی جبکہ ایسے ممالک میں جمہوریت کا فلسفہ اور تجربہ اس وقت تک قابل عمل نہیں ہوتا جب تک عوام کی جمہوری تربیت نہ کی جائے اور معاشی خوشحالی کے لئے ضروری اقدامات نہ کئے جائیں۔ قومی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں ایسا تعلیمی نظام رائج کیا جائے جو عوام میں قومی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت پیدا کرے۔ مختصر یہ کہ ایسا معاشی اور تعلیمی نظام وضع کرنے کی ضرورت ہے جس کے نتیجے میں یکساں ذہن اور سوچ و فکر کی حامل نسل تیار کی جائے جو

قومی تقاضوں کو آگے بڑھاتے ہوئے ملک کی تعمیر و ترقی کا ذریعہ ثابت ہو۔ اس کے علاوہ جمہوری عمل کو آگے بڑھانے کے لئے انتخابی شعور کی بیداری بھی بہت ضروری ہے۔ لیکن پچاس سال گزر جانے کے باوجود ہمارے ملک کے غریب عوام کو کھانے کے لئے دو وقت کی روٹی، بدن ڈھانپنے کے لئے کپڑا اور سر چھپانے کے لئے چھت میسر نہیں۔ دیہی علاقوں میں جہاں ملک کی تقریباً" ستر ۷۰ فیصد آبادی رہتی ہے، غریب کسان، زرعی مزدور، مختلف پیشوں سے وابستہ ہنرمند افراد، جاگیرداروں، وڈیروں اور سجادہ نشینوں کی خود ساختہ اسٹیٹس میں انتہائی کسمپرسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اپنے گھروں کے فیصلے خود نہیں کر سکتے۔ ایک مزارع یا زرعی مزدور کی یہ حالت ہے کہ وہ سردار کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا اور اگر غلطی سے ایسی گستاخی کا مرتکب ہو بھی جائے تو اسے اس کے مویشیوں، زیورات اور دیگر اثاثے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس کے پاس کوئی قیمتی سازوسامان نہ ہو تو اس کی بیوی یا بیٹی کی عصمت و آبرو کو نشانہ بنایا جاتا ہے اگر کچھ بھی نہ ہو تو اسے برسرعام رسوا کیا جاتا ہے۔[۴۹] مختصر یہ کہ ہمارے معاشرے کا یہ پسماندہ طبقہ بے شمار مصائب یعنی بیروزگاری، غربت و افلاس اور اس کے علاوہ کہیں نوکر شاہی تو کہیں وڈیرہ شاہی کے استحصال کا شکار ہے۔ جبکہ زمیندار، پولیس اور پٹواری کا ظلم و تشدد ہمہ وقت اور فوری ہے۔ ان حالات میں یہ طبقہ اپنے ووٹ کو، جسے قوم کی مقدس امانت قرار دیا جاتا ہے کیسے آزادانہ استعمال کر سکتا ہے؟ شہروں میں بسنے والے محنت کش عوام کی حالت زار بھی بہتر نہیں ہے۔ مہنگائی کے اس دور میں دو وقت کی روٹی کمانا، سر چھپانے کے لئے گھر، طبی اور تعلیمی سہولتوں کے فقدان اور حیلے بہانوں سے حکومتی اہلکاروں کی جانب سے ہراساں کیے رکھنے کے عمل نے ان کی زندگی دوبھر کی ہوئی ہے۔ جہاں تک صنعتی مزدوروں کا معاملہ ہے اگرچہ قومی اقتصادیات میں انہیں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے اور تمام تر معاشی و اقتصادی ترقی کا انحصار ان ہی کی محنت شاقہ کا مرہون منت ہے۔ جب تک ان لوگوں کو ذہنی آزادی اور معاشرتی فارغ البالی سے ہمکنار نہیں کیا جاتا، ان کی سوچ سے جبر اور تشدد کے پہرے نہیں ہٹائے جاتے، آزادی رائے کا تصور ممکن نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ انتخابات میں رائے دہندگان کو ڈرا دھمکا کر ووٹ حاصل کرنے کا گھٹیا حربہ استعمال کیا جاتا ہے اور دولت کا استعمال اور غنڈہ گردی عام معمول بن چکی ہے۔ ان ہتھکنڈوں کو ختم کرنے کے لئے مناسب قانون سازی کی ضرورت ہے، تاکہ ایک سفید پوش آدمی بھی انتخابات میں حصہ

لینے کے بارے میں سوچ سکے اور ملک کی بڑی جماعتیں بھی انہیں انتخابی ٹکٹ دینے کے لئے تیار ہوں۔[۵۰] ورنہ موجودہ نظام کے تحت صرف وہی لوگ کامیاب ہوتے رہیں گے جن کے پاس انتخابی مہم کے لئے وافر دولت موجود ہے اور غیر قانونی ہتھکنڈے اختیار کرنے کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ جب تک ملک کے پسماندہ طبقات کی حالت زار بہتر بنانے کے لئے جامع منصوبہ بندی نہیں کی جاتی اور ملک و قوم کی مالی حالت بہتر بنانے کے لئے ضروری اقدامات نہیں کئے جاتے اور قوم کو بامقصد تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے نظام تعلیم میں ضروری ردوبدل نہیں کیا جاتا' صحت مند جمہوری اداروں کے قیام کی کوششیں بار آور نہیں ہوسکتیں۔ اس کے علاوہ جب تک انتخابی سیاست پر وقتی مفادات' دھڑے بندیوں' برادری ازم اور جاگیردارانہ ذہنیت کے سایے مسلط رہیں گے ملک صحت مند جمہوریت کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہوسکتا۔ خاص طور پر پاکستان جیسے ملک میں جہاں پارٹی منشور کی بجائے شخصیت پسندی کی بنیاد پر انتخابات کے فیصلے ہوتے ہوں وہاں سیاسی جماعتوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسے افراد کو انتخابی ٹکٹ دیں جو پارٹی سے نظریاتی وابستگی رکھتے ہوں اور پارٹی منشور کے مطابق عوام کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہوں' اپنی ذات کی بجائے قومی مفادات کے لئے قربانی کے لئے ہمہ وقت تیار ہوں' اور ملک و قوم کی ایک ایک پائی کو مقدس امانت سمجھتے ہوں۔ صحت مند جمہوریت کے فروغ کے لئے اگر یہ مسائل پیش نظر رکھتے ہوئے ماضی کی غلطیوں سے گریز اور مخلص و دیانتدار قیادت کو آگے بڑھانے کا عزم کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا ملک بہت جلد دنیا کی مثالی ترقی یافتہ جمہوری ریاستوں کی صف میں شامل نہ ہو۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی قسمت کا تعین کریں' ہماری سوچ مثبت ہو' ہمارے بازوؤں میں عمل کی قوت موجود ہو اور ہم بے لوث خدمت کے جذبے سے سرشار ہوں۔ اگر ایسا ہوجائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اکیسویں صدی میں دنیا کی ایک مثالی قوم نہ بن جائیں۔

حوالہ جات

۱۔ میگنا کارٹا جسے گریٹ چارٹر بھی کہا جاتا ہے ۱۲۱۵ء میں ترتیب دیا گیا تھا جس کے تحت انگلستان کے بادشاہ جان لیک لینڈ نے اپنے اختیارات میں کمی کرتے ہوئے عوام کے تحفظ اور چرچ کی مکمل آزادی کا اعلان کیا اور اس طرح اس ریاست میں جمہوری سفر کا آغاز ہوا

۲۔ گوہر سلطانہ عظمیٰ، جمہوریت کے قاتل کون، لاہور، ۱۹۹۳، ۲۳۔۲۴۔

۳۔ اس سے قبل ۱۸۷۲ء میں بمبئی میونسپل کونسل کی نصف تعداد کو سب سے پہلی بار محصول ادا کرنے والوں نے منتخب کیا اور اسی طرح ۱۸۷۸ء میں کلکتہ کونسل بھی منتخب ہوئی تھی۔ جبکہ لارڈ رپن نے ۱۸۸۲ء میں مقامی حکومت خود اختیاری کی تجویز منظور کی اور سیاسی و عوامی تعلیم کے لئے دیہی علاقوں میں ڈسٹرکٹ بورڈ اور شہروں میں میونسپل کمیٹیوں کا سلسلہ قائم کیا جن میں نصف یا نصف سے زائد ممبر منتخب ہوتے تھے۔ ایضاً، ۳۲۔۳۸
مزید دیکھئے:

Muhammad Khurshid, 'The Role of the Unionist Party in the Punjab Politics: 1923-1936, unpublished Ph.D. Dissertation, University of Bahawalpur, 1992, 13.

۴۔ رونلڈ سیگل، بھارت کا بحران، (اردو ترجمہ)، لاہور، ۱۹۶۹ء، ۹۵ ـ ۹۶

۵۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں ۶۰ ارکان کی حد تک توسیع کر دی گئی جن میں سے ۲۸ نامزد سرکاری ارکان اور ۵ نامزد غیر سرکاری ارکان اور باقی ۲۷ غیر سرکاری ارکان کا انتخاب صوبوں کی قانون ساز کونسلوں کے سپرد کیا گیا۔ صوبوں کی قانون ساز کونسلوں میں بھی غیر سرکاری ارکان کی اکثریت قائم کی گئی اگرچہ ان کے لئے بالواسطہ انتخاب کا طریقہ نافذ کیا گیا۔ دیکھئے: V.D. Mahajan, British Rule in India and After, Delhi, 1963, 310-316.

۶۔ K.V. Punnaiah, The Constitutional History of Indian,

Lahore, n.d. Also see V.D. Mahajan, op.cit., 343-348.

۷۔ رونلڈ سیگل، بحوالہ سابقہ، ۹۹۔۱۰۰

۸۔ V.D. Mahajan , op.cit., 366-386.

۹۔ ان انتخابات میں جاگیرداروں کے علاوہ کئی ایک پیر اور سجادہ نشین بھی اسمبلیوں تک پہنچے مثلاً" شیر گڑھ کے پیر سید محمد حسین ۱۹۲۰ء کے انتخابات میں اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے

۱۰۔ فیروز خان نون، چشم دید، لاہور، ۱۹۷۴ء، ۱۳۸۔ ۱۳۹

۱۱۔ مولوی طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، دہلی، ۱۹۴۵ء، ۴۶۴۔ ۴۶۵

۱۲۔ احمد سلیم، ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں، لاہور، ۱۹۹۰ء ۴۲

۱۳۔ سید نور احمد، مارشل لاء سے مارشل لاء تک، لاہور، ۱۹۶۵ء، ۱۸۱۔۱۸۲

۱۴۔ نیپال کی سرحد سے ذرا ادھر میں نے ایک مسلمان کسان کو روک کر ... کہا ووٹ کسے دو گے۔ کسان نے کہا میاں! ہمارا ووٹ کلمہ کے ساتھ ہے۔ میں نے پوچھا کلمہ سے تمہارا مطلب کیا ہے ؟ کسان نے جواب دیا مسلم لیگ ... اس کسان کی تصویر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ کسان پاکستان نہیں آیا ہوگا اور نہ وہ آسکتا تھا، لیکن جس یقین کے ساتھ اس نے جواب دیا وہ میرے دل پر نقش ہے، اس کا یقین ان بے یقین تعلق داروں سے کہیں زیادہ مضبوط تھا جو اپنے مفادات اور تحفظات کے لئے اسے استعمال کر رہے تھے۔ شورش کاشمیری، بوئے گل نالہ دل، دود چراغ محفل (جلد اول)، لاہور، ۱۹۷۲ء، ۲۹۶۔ ۲۹۷

۱۵۔ تفصیل کے لئے دیکھئے : عبداللہ ملک، فوج اور پاکستان (جلد نمبر ۲)، لاہور، ۱۹۸۸ء، ۲۹۷۔ ۲۹۸

۱۶۔ ایم۔اے۔کے چوہدری، مارشل لاء کا سیاسی انداز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ۹۱۔۹۳

۱۷۔ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کل ۶۹ ارکان پر مشتمل تھی جن میں سے ۴۴ کا تعلق مشرقی پاکستان، ۱۷ کا تعلق پنجاب، ۴ کا تعلق سندھ، ۳ کا تعلق صوبہ سرحد، اور ایک کا تعلق بلوچستان سے تھا۔ عقیل عباس جعفری، پاکستان کی انتخابی سیاست، لاہور، ۱۹۹۶ء، ۱۶

۱۸۔ جاگیرداروں کی سیاسی حکمت عملی اور طرز عمل کے لئے دیکھئے : وکیل انجم، سیاست کے فرعون، لاہور، ۱۹۹۲ء۔ مزید دیکھئے : وکیل انجم، سیاستدانوں کی قلابازیاں، (جلد اول)، لاہور، ۱۹۹۵ء

۱۹۔ شورش کاشمیری، بحوالہ سابقہ، ۳۰۷

۲۰۔ افضل توصیف، الیکشن، جمہوریت، مارشل لاء، لاہور، ۱۹۹۰ء، ۱۵

۲۱۔ Louis D. Hayes, The Struggle for Legitimacy in Pakistan, Lahore, 1986, 16-18.

۲۲۔ یہ تینوں سید زادے، سید غلام مصطفیٰ شاہ کے بیٹے تھے۔ سید علمدار حسین ۱۹۵۳ء میں صوبائی وزیر صحت کے منصب پر فائز ہوئے۔ تہور علی خان، بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان، لاہور (ایڈیشن ۱۹۵۵ء۔۱۹۵۶ء)، ۹۔ مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے : عقیل عباس جعفری، پاکستان کے سیاسی وڈیرے، (اشاعت چہارم)، لاہور، ۱۹۹۶ء، ۳۴۳۔۳۴۷

۲۳۔ یہ دونوں نوابزادے، نواب فضل علی کے بیٹے تھے جو ۱۹۳۷ء میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۵۱ء کے صوبائی انتخابات میں نوابزادہ مہدی علی خان کامیاب ہوئے مگر اس کے بعد سیاست کے میدان میں ان کا نام کہیں نظر نہیں آتا۔ نوابزادہ اصغر علی پہلی مرتبہ اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۹۴۳ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۶ء میں یونینسٹ پارٹی کی ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن بنے مگر جب مسلم لیگ کا ستارہ عروج پر دیکھا تو اس جماعت میں شامل ہوگئے۔ ۱۹۵۱ء میں مسلم لیگ کی ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ بعد ازاں کنونشن لیگ اور پھر پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے۔ ایضاً، ۳۸۶۔۳۹۱

۲۴۔ پاکستان ٹائمز (روزنامہ)، لاہور، ۱۶ مئی ۱۹۵۳ء

۲۵۔ گوہر سلطانہ عظمیٰ، بحوالہ سابقہ، ۹۳۔۹۴

۲۶۔ پاکستان کی دوسری دستور ساز اسمبلی میں مغربی پاکستان سے ۴۰ ارکان میں سے ۲۸ جاگیردار تھے جبکہ بنگالی ارکان میں سے ایک بھی جاگیردار نہیں تھا۔ ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان

کیوں ٹوٹا' لاہور' ۱۹۹۰ء' ۱۶

۲۷۔ گوہر سلطانہ عظمیٰ' بحوالہ سابقہ' ۹۴

۲۸۔ ایضاً' ۹۴

۲۹۔ ڈاکٹر صفدر محمود' بحوالہ سابقہ' ۳۴۔۳۵

۳۰۔ افضل توصیف' بحوالہ سابقہ' ۲۵

۳۱۔ ایضاً' ۳۴

۳۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: عقیل عباس جعفری' پاکستان کی انتخابی سیاست' ۵۲۔۶۷

۳۳۔ افضل توصیف' بحوالہ سابقہ' ۳۵۔۳۶

۳۴۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے: سلیم یونس' سیاسی اتحاد اور پاکستانی سیاست پر اثرات: ۱۹۴۷ء۔۱۹۹۰ء' لاہور' ۱۹۹۳ء' ۱۱۶۔ ۱۳۶۔ مزید دیکھئے: منیر احمد' جرنیل شاہی' لاہور' ۱۹۹۵ء' ۱۷۔ انتخابی نتائج کے لئے دیکھئے: سلیم یونس' بحوالہ سابقہ' ۱۱۵۔ پاکستان قومی اتحاد کی عوامی احتجاجی ملک گیر تحریک کی تفصیلات کے لئے دیکھئے: ایضاً' ۱۱۸۔ ۱۴۶

۳۵۔ پروفیسر غفور احمد' ... اور الیکشن نہ ہو سکے' لاہور' ۱۹۹۰ء' ۱۳۔۱۴

۳۶۔ رفیق ڈوگر کے تحریر کرنے کے مطابق ایم آر ڈی کا اصل مقصد سیاستدانوں کے اہم فیصلوں سے انٹیلی جینس ایجنسیوں کو آگاہ کرنا تھا۔ سردار عبدالقیوم' ضیاء الحق کے کہنے پر ایم آر ڈی میں شامل ہوئے تاکہ وہ لمحہ بہ لمحہ خبروں سے جی۔ایچ۔کیو کو آگاہ کر سکیں
رفیق ڈوگر' پاکستان' فوج اور سیاست' لاہور' ۱۹۹۰ء

۳۷۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے: وکیل انجم' سیاست کے فرعون' مزید دیکھئے: وکیل انجم سیاستدانوں کی قلا بازیاں

۳۸۔ عقیل عباس جعفری' بحوالہ سابقہ' ۱۳۱

۳۹۔ ایضاً' ۱۷۱۔ ۲۲۳

۴۰۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے: منیر احمد' پاکستان میں انٹیلی جنیس ایجنسیوں کا سیاسی کردار' لاہور' ۱۹۹۵ء

۴۱۔ رفیق ڈوگر، بحوالہ سابقہ

۴۲۔ منیر احمد، پاکستان ٹوٹ جائے گا، لاہور، ۱۹۹۶ء، ۹۹۔۱۰۰

نوٹ :۔ محب وطن پاکستانی ہونے کے ناطے کسی بھی مصنف کو اس طرح کے عنوان دینے سے گریز کرنا چاہئے۔ پاکستان انشااللہ رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ مزید برآں ۱۹۹۰ء کے انتخابات کے تجزیے کے لئے دیکھئے : عابد تہامی، انتخابات ۹۰ء کا وائٹ پیپر، لاہور، ۱۹۹۱ء

۴۳۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے : عقیل عباس جعفری، بحوالہ سابقہ، ۲۸۶۔۳۲۸

۴۴۔ نتائج کی تفصیل درج ذیل ہے :

پارٹی	قومی اسمبلی	پنجاب	سندھ	سرحد	بلوچستان
مسلم لیگ (ن)	۱۳۴	۲۱۲	۱۴	۳۱	۰۴
اے این پی	۰۹	x	x	۲۸	x
پیپلز پارٹی	۱۹	۱	۳۵	۰۴	۰۱
ایم کیو ایم (حق پرست)	۱۲	x	۲۸	x	x

نوائے وقت (روزنامہ)، لاہور، ۵ فروری ۱۹۹۷ء۔

۴۵۔ ۳ فروری ۱۹۹۷ء کے انتخابات کے نتائج کے تحت قومی اسمبلی میں ۷۱ نئے چہرے آئے، ۴۷ دوسری مرتبہ رکن منتخب ہوئے، ۳۵ سیاستدان تیسری مرتبہ اسمبلی میں پہنچے اور چوتھی بار ایم این اے بننے والوں کی تعداد ۲۳ ہے۔ اگر ۷۱ نئے چہروں کے حسب نسب کا جائزہ لیا جائے، ان کی اکثریت ان ہی خاندانوں سے ہے جو قیام پاکستان کے وقت سے اس ملک پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ جنگ (روزنامہ)، لاہور، ۵ فروری ۱۹۹۷ء

۴۶۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے : وکیل انجم، سیاستدانوں کی قلابازیاں۔ اس کے علاوہ نتائج سے یہ بخوبی علم ہوجاتا ہے کہ یہ سیاستدان کس طرح جماعتیں بدلتے رہے۔ تفصیل کے لئے

دیکھئے: عقیل عباس جعفری، بحوالہ سابقہ

۴۷۔ منیر احمد جرنیل شاہی، ۱۷

۴۸۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۳ء کے صوبائی انتخابات میں پنجاب کے حلقہ نمبر ۲۲۰ سے میاں شہاب الدین اویسی پیپلز پارٹی کی ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ مقابلے میں ان کے حقیقی بھائی میاں نجیب الدین اویسی مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے تھے۔ جبکہ ۳ فروری ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں میاں نجیب الدین اویسی اسی علاقے سے فاروق اعظم کے مقابلے میں مسلم لیگ (ن) کی ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ میاں شہاب الدین اویسی ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۳ء تک برابر اس حلقے سے کامیاب ہوتے آئے ہیں۔ مقصد یہ کہ پارٹی خواہ کوئی بھی برسراقتدار آئے یہ نشست بدستور اویسی خاندان کے قبضے میں رہی ہے۔ جنگ (روزنامہ) الیکشن سپیشل، لاہور، ۲۹ دسمبر ۱۹۹۶ء۔ خبریں (روزنامہ)، لاہور، ۵ فروری ۱۹۹۷ء۔ مزید دیکھئے: اسد سلیم شیخ، پاکستان، جمہوریت اور انتخابات، لاہور، ۱۹۹۴ء، ۴۰۰

۴۹۔ یادش بخیر، راقم الحروف نے اپنے لڑکپن میں ایک ایسا منظر دیکھا جسے آج تک نہیں بھلا سکا۔ واقعہ کچھ اس طرح کہ میں ۱۹۵۷ء میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اسکول میں بریک ٹائم تھا، باہر نکلا تو دیکھا علاقے کے بڑے جاگیردار گھوڑے پر سوار جارہے تھے۔ ان کے گھوڑے کے ساتھ تقریباً ۲۰ افراد بھاگ رہے تھے جو کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایک فرد اپنی پگڑی ہاتھ میں لئے، اپنا سر گھوڑے کے قریب کئے ہوئے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا اور سردار صاحب اپنا خوبصورت جوتا اس کے سر پر مارتے جا رہے تھے۔

۵۰۔ ۳ فروری ۱۹۹۷ء کو منعقد ہونے والے انتخابات میں تحریک انصاف کے قائد عمران خان نے متوسط طبقے کے پڑھے لکھے افراد کو انتخابی ٹکٹ دیئے۔ لیکن اپنی شرافت اور دیانتداری کی بنیاد پر خود پارٹی لیڈر اور ان کی جماعت کا کوئی بھی امیدوار کامیاب نہیں ہوسکا۔ تفصیلات کے لئے ۴ فروری سے ۶ فروری ۱۹۹۷ء کے قومی اخبارات دیکھئے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ادبیات

سہ ماہی

اسلام آباد

اکادمی ادبیات پاکستان' اسلام آباد کا موقر سہ ماہی مجلہ **ادبیات** جو خوبصورت کتابت و طباعت کے ساتھ نہایت کم قیمت میں پاکستانی ادب پر بیحد معیاری تحقیقی' تنقیدی اور تخلیقی نگارشات پیش کرتا ہے۔

بدلِ اشتراک

اندرونِ ملک :

فی شمارہ : ۲۰ روپے

سالانہ : ۷۵ روپے

(بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)

بیرونِ ملک :

امریکہ' کینیڈا' یورپ' مشرقِ بعید

فی شمارہ ، ۷ ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

سالانہ چندہ : ۲۵ ڈالر (" ")

مشرقِ وسطیٰ، بھارت، شمالی افریقہ

فی شمارہ : ۶ ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

سالانہ چندہ : ۲۲ ڈالر (" ")

اکادمی اَدبیات پاکِستان' سیکٹر ایچ - ایٹ / ون اسلام آباد - فون ۲۵۴۵۶۸